R. No. 2186/57 Regd. No. L. 923

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

ٹیلیفون - ۲۹
قیمت فی پرچہ [illegible]
سالانہ چندہ [illegible]

تاریخ اشاعت
۱۵-۶-۶۵

جلد ۲۴ - شمارہ ۲۳ | ایڈیٹر:- آل احمد سرور | ۱۵ جون ۱۹۶۵ء

اداریہ

یو۔پی کے ممبران اسمبلی و کونسل کی عرضداشت

ہم برابر کہتے آئے ہیں کہ اسمبلی و کونسل کے ممبروں کو اردو کے لیے سہولتوں کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ یہ ممبر اپنے اپنے حلقے کی اکثریت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان میں مختلف سیاسی پارٹیوں کے ممبر شامل ہیں اس لیے ان کی بات میں وزن ہوتا ہے اور یہ رائے عامہ اور حکومت دونوں پر اثر ڈال سکتے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ اب کے ۲۴۳ یو۔پی اسمبلی و کونسل کے ممبروں نے صدر جمہوریہ کی خدمت میں یہ عرضداشت پیش کی ہے کہ وہ دفعہ ۳۴۷ کے تحت اردو کو اتر پردیش کی دوسری سرکاری زبان تسلیم کرلیں۔ ہم جناب جمیل الرحمٰن قدوائی اور جناب عبدالرؤف صاحبان کو ان کی مساعی پر مبارکباد دیتے ہیں اور ان تمام ممبران کو بھی جنھوں نے اس عرضداشت پر دستخط کیے ہیں۔

یہ بات اب روز روشن کی طرح واضح ہو گئی ہے کہ اتر پردیش کے تقریباً اسی لاکھ اردو بولنے والوں کو جو اس کی آبادی کے دس فیصدی سے کچھ زیادہ ہی ہیں، آزادی کے بعد سے ہی بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ شروع ہی میں ایک سرکاری اعلان کے ذریعے سب کی مادری زبان ہندی قرار دے دی گئی۔ جب اس پر احتجاج کیا گیا تو یہ اعلان منسوخ ہوا۔ مگر اس نے بہر حال نقصان تو پہنچا دیا۔ اس کے بعد جب مرکزی حکومت نے انجمن ترقی اردو کی دستخطی مہم اور توجہ نامے کے زیر اثر اردو کے متعلق چند سہولتوں کا اعلان کیا تو اگرچہ ریاستی حکومت نے اسے تسلیم کرلیا، مگر اس پر عمل برائے نام ہوا۔ پھر ریاستوں کی تنظیم نو کے سلسلے میں پارلیمنٹ نے لسانی اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا۔ دستور میں دفعہ ۳۵۰ الف بڑھائی اور صدر کو سفارش کی کہ ایک لسانی اقلیتوں کے کمشنر کا تقرر کرے۔ دفعہ ۳۵۰ الف کے تحت بچوں کے لیے ان کی مادری زبان میں تعلیم کا معقول انتظام کرنا ریاستی حکومت کا فرض تھا، مگر اس نے اس فرض سے تغافل برتا۔ کمشنر نے ہر رپورٹ میں ریاستی حکومت کی کوتاہیوں کی طرف توجہ دلائی، مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

ادھر اسمبلی اور کونسل کے ممبروں کو ساری کارروائی صرف ہندی میں چھپا کر دی جاتی رہی۔ سہ لسانی فارمولا آیا تو گو اس کا مقصد تیسری زبان کے طور پر کوئی جدید ہندوستانی زبان پڑھانا تھا مگر انتظام زیادہ تر سنسکرت کا ہوا۔ کہیں کہیں شور مچانے پر اردو کا بھی انتظام کر دیا گیا۔ اس صورت حال میں ضروری تھا کہ مختلف سیاسی پارٹیوں کے ممبر جو اس وقت اسمبلی اور کونسل میں ہیں صدر کو توجہ دلائیں اور اردو کو اتر پردیش میں سرکاری حیثیت سے تسلیم کرنے کا مطالبہ کریں۔ شکر ہے کہ ممبروں کو اپنے فرض کا احساس ہوا۔ انجمن ترقی اردو ہند وزیر اعظم کی خدمت میں اپنی عرضداشت بھیج چکی ہے اور وہ ان سے اس سلسلے میں جلد ملنے والی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ صدر کو جلد سے جلد مشورہ دیں گے کہ وہ دفعہ ۳۴۷ کے تحت اپنا اختیار استعمال کریں۔ اتر پردیش اردو کا گھر ہے۔ مردم شماری میں تو صرف قریب اسی لاکھ نے اپنی مادری زبان اردو لکھوائی ہے لیکن اردو بولنے والے اور اردو سمجھنے والے اس سے زیادہ تعداد میں ہیں۔ ان کے جذبات کا لحاظ کرنا اور ان کو وہ سب سہولتیں دینا جن کی وجہ سے وہ قومی زندگی میں بھرپور حصہ لے سکیں، ہماری جمہوریت کے استحکام

اس شمارے میں

اور قومی یکجہتی کے لیے اشد ضروری ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ صدر جمہوریہ اب اس ضروری کام میں تاخیر نہ کریں گے۔

سیر بین

دوسری ہفتے سے سیر بین کا کالم نہیں نکلا۔ جب یہ کالم شروع ہوا تھا تو خیال تھا کہ اسٹینس مین کی پیر کی دلی ڈائری کی طرح اس کے لیے بھی لکھنے والوں کی ایک ٹیم مل جائے گی۔ مگر یہ امید موہوم ثابت ہوئی اور سے آخر کے تئیں ہمیں اکیلا ہی سدھارا۔

سیر بین صرف مزاحیہ کالم نہیں ہے یہ ایک کشکول ہے۔ اس میں آپ کو معلومات، تاثرات، ذہانات، سبھی کے نمونے ملیں گے۔ کبھی کبھار ہم عصروں کے خیالات پر تنقید بھی، آج کل ویسے ہی تحقیق اور تنقید ایک دوسرے کے آس پاس ہی نظر آئیں گے۔

طلبا کے ایک ہنگامے میں موٹروں کی خاص طور پر خبر لی گئی۔ سنا ہے کہ جب کئی موٹروں کے شیشے توڑے جا چکے تو ایک ایسی موٹر نظر آئی جو پہلے ہی سے حق بخشوائے ہوئے تھی۔ طلبا نے اس کو اچھوتا ہی رہنے دیا اور کہا کہ اس کی مرمت کی گنجائش نہیں ہے۔ اب سنا ہے کہ موٹر کے مالک ہر جگہ یہ تاویل کرتے پھرتے ہیں کہ چونکہ ان کی موٹر دو موٹروں کے بیچ میں پھنسی ہوئی تھی، طلبا اس تک نہ پہنچ سکے، مگر لوگوں کو اصرار ہے کہ صحیح واقعہ ضرور بیان کر دیا جائے۔ چنانچہ ہم نے بھی اس لیے اس کا ذکر کر دیا ہے کہ اس طرح شاید سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔

شری راجا گوپال آچاریہ نے ایک بیان میں کہا ہے کہ ہندی در اصل اردو اور پنجابی کو ان کے حقوق سے محروم کرنا چاہتی ہے۔ ہم نے سنا تھا کہ جو بات افسانہ نگار اپنے افسانے میں بہت پہلے بیان کر دیتا ہے حقیقت اس منزل تک بعد میں پہنچتی ہے۔ معلوم ہوا کہ سیاست کی دنیا اس سے بھی سست رفتار ہے۔ جو بات پندرہ برس سے سبھی اہل نظر جانتے ہیں وہ راجہ جی پر اب جا کر روشن ہوئی ہے اور ارباب سیاست پر شاید اگلے پندرہ برس میں روشن ہو جو اس وقت اقتدار سنبھالے ہوئے ہیں۔

خبیر لکھنوی کا انتقال

لکھنؤ ۲ر جون۔ اردو کے ممتاز شاعر اور مرثیہ گو جناب مرزا فراز حسین خبیر لکھنوی کا آج دن میں ساڑھے بارہ بجے بریلی میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم کی عمر تقریباً ستر سال تھی۔

خبیر صاحب محرم کے مہینے میں مجالس پڑھنے بریلی گئے تھے جہاں ان کو قلبی دورہ پڑا تھا اور اسپتال میں داخل کر دیے گئے تھے وہاں ان کی طبیعت بہتر ہو گئی تھی اور وہ لکھنؤ واپس آنے والے تھے کہ اچانک دوسرا دورہ پڑا اور حرکت قلب رک گئی۔

خبیر صاحب مرزا دبیر کے بیٹے مرزا اوج لکھنوی کے شاگرد تھے اور دبیر اسکول کے بہت ممتاز علم بردار تھے۔

مرزا خبیر لکھنوی شاعری میں استاد کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کے تلامذہ بڑی تعداد میں ہیں۔ جن میں ڈاکٹر رفیق حسین، نواب حیدر علی خاں سنبل محل حشم، شکیل رضوی اور مہر لکھنوی قابل ذکر ہیں۔

مرحوم نے آخری زمانے "یادگار دبیر کمیٹی" قائم کی تھی۔ جس کے ذریعہ وہ مزار دبیر کی درستی کرانا چاہتے تھے۔ (قومی آواز)

سید جعفر حسین منظر لکھنوی کا انتقال

لکھنؤ ۳۰ر مئی۔ سید جعفر حسین منظر لکھنوی کا جو بقول پنڈت آنند نرائن ملا "اس لکھنوی اسکول کے جو اب قصہ ماضی بن چکا ہے چند آخری تابناک چراغوں میں سے تھے" آج یہاں ۸۰ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

حضرت منظر لکھنوی کی غزلوں کا مجموعہ "منظرستان" ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا اور اس پر حکومت اتر پردیش سے انعام بھی ملا تھا۔ اس سے قبل ۱۹۵۱ء میں "پروانہ جنت" بمبئی سے شائع ہوا تھا جو نعت و منقبت پر مشتمل ہے۔ (ہفتہ وار سورج گیا)

حرمت الاکرام کو صدمہ

ادبی حلقوں میں یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ اردو کے مشہور شاعر سید حرمت الاکرام کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ (نامہ نگار)

افکار کا فیض نمبر

پاکستان کے چوٹی کے شاعر فیض احمد فیض کی ۷۴ ویں سالگرہ پر ماہنامہ افکار کراچی نے ایک مبسوط نمبر شایع کیا ہے جو ضخامت مضامین اور تصویروں کے تاریخی احاطہ کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ فیض نمبر ۷۰۶ صفحات اور ۹ حصوں پر مشتمل ہے اور اس میں پاکستان اور ہندوستان کے چوٹی کے لکھنے والے شریک ہیں جن میں سے چند یہ ہیں،

جوش ملیح آبادی، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر آل احمد سرور، ممتاز حسین، شاہد احمد دہلوی، ابن انشا، الیس فیضی، وغیرہ۔

نادم سیتاپوری

کچھ گلکدۂ عزیز کے بارے میں

(گزشتہ سے پیوستہ)

یاس فرقوت سے عزیز کے جو ادبی و شعری مباحثے ہوئے پرانے اخبارات و رسائل کے فائل گواہ ہیں ان میں ہمیشہ مولانا اشہر ہی پیش پیش دکھائی دئیے۔ اس سلسلے میں عزیز اور اشہر کے درمیان جو علمی و ادبی سلسلہ مراسلت قائم تھا ان میں سے اکثر خطوط میری نظر سے گزرے ہیں جن کے مطالعے سے نہ صرف عزیز اور اشہر کے تعلقات کی گیرائی اور گہرائی کی صحیح تصویر سامنے آجاتی ہے بلکہ تاریخ ادب کے بہت سے بھولے ہوئے افسانوں کی یاد بھی تازہ ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے کے بہت سے خطوط تلف ہو چکے ہیں پھر بھی ڈیڑھ دو درجن خطوط میں نے محفوظ کر لیے ہیں۔ عزیز کے شعری مجموعوں کے انتخاب اور اشاعتی پروگرام سے مولانا اشہر کو جو گہرا تعلق رہا ہے اس کی تفصیلات انھیں کی زبانی سن لیں ــــ جو موصوف نے میرے استفسار پر اپنے ایک گرامی نامہ میں تحریر فرمائی ہیں۔ اور مولانا اشہر کا یہ مکتوب گرامی اپنی علمی اور ادبی افادیت کے لحاظ سے اردو ادب کی تاریخ کا ایک ایسا جزو ہے جسے محفوظ ہی رکھنا چاہیے۔

مکرمی نادم صاحب۔ تسلیم

حسب استفسار عزیز مرحوم اور ان کے دونوں مطبوعہ دیوانوں (گلکدہ اور انجم کدہ) کے متعلق حسب ذیل سطور حاضر ہیں۔

مولوی مرزا محمد ہادی صاحب عزیز مرحوم۔ میرے عزیز بھی تھے دوست یکدل بھی تھے اور ہم سبق بھی! یعنی مولوی سید اولاد حسین صاحب شاداں بلگرامی مغفور سے ہم دونوں نے اکتساب علم فارسی کیا تھا اور سلطان المدارس لکھنؤ میں بھی ساتھ رہا۔ خلاصہ یہ کہ علمی، ادبی اور خانگی معاملات میں ہمیشہ مجھ سے مشورہ کرتے تھے۔ ۱۹۱۷ء میں مجموعہ کلام کی طباعت کا خیال پیدا ہوا تو خود تحریر کردہ جلد میرے پاس انتخاب اشعار کے لیے بھیجی۔ اس زمانے میں میرا تقرر گورنمنٹ ہائی اسکول سیتاپور میں بحیثیت ہیڈ مولوی ہوا تھا میں نے انتخاب کرکے بھیج دیا اور بعض اشعار جو میرے نزدیک "سخن بند" تھے نوٹ کر دئے۔

ان کے ذوق صحیح اور خود شناسی و خیر شناسی کی یہ روشن دلیل ہے کہ انھوں نے وہ اشعار قلمزد کر دئے!

"گلکدہ" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۸ء جب نولکشور پریس لکھنؤ میں شایع ہوا تھا اور سب سے پہلے اس پر میرا ہی تبصرہ (معہ زمانہ ارتقائے تخیل عزیز) روزانہ اخبار سرفراز لکھنؤ میں شایع ہوا تھا۔ اس کے بعد مولانا تاجور نجیب آبادی مرحوم وغیرہ ہم نے کلام عزیز پر جو تنقیدیں کیں ان سب کا جواب تنہا میرے ہی قلم نے دیا تھا۔ اسی طرح "قصاید عزیز" پر جو معرکۃ الآرا اعتراضات مولوی ابن صاحب (مولانا ظفر مہدی گہر) برادر مولوی سبط حسن صاحب مرحوم نے کیے تھے ان کا جواب بھی میں نے ہی دیا جس کے لیے وہ تاحیات میرے شکرگزار رہے!

پھر مانی جائسی مرحوم نے اعتراضات فرمائے ان کے بھی جوابات میرے ہی قلم سے "دور جدید" آگرہ میں نکلے؟

مجھے مسرت ہے کہ عزیز مرحوم کے متعلق ان کی حیات اور بعد حیات سب سے زیادہ مضامین میں نے ہی لکھے!

نظارہ (میرٹھ) میں نجو دھوانی مرحوم اور یاس عظیم آبادی مرحوم نے کلام عزیز پر جو اعتراضات کیے تھے اور جن کا سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا اس وقت بھی اس معرکہ میں میں ہی "سینہ سپر" تھا!

(یہ سب تحریریں شیخ ممتاز حسین جونپوری مرحوم یہ کہہ کر مجھ سے لے گئے تھے کہ حیات صاحب (خلف عزیز) کا اصرار ہے کہ میں عزیز پر کچھ لکھوں ـــ لیکن میرے پاس مواد نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے تمام مواد پیش کر دیا جو جونپوری مرحوم کے یہاں رہ گیا)

ہاں۔ تو جناب نندلال پروانہ کے پاس "گلکدہ" کا جو نسخہ ہے وہ دوسرا ایڈیشن ہے جو ۱۹۲۶ء میں نظامی پریس لکھنؤ میں چھپا تھا اور جس کے صفحہ ۵۰ پر یہ مطلع ہے۔

ہر داغ دل ہے گویا تاریخ میرے تن میں
جلوے ہیں رفتگاں کے پیدا اسی چمن میں

مگر پہلے ایڈیشن کے صفحہ ۱۸ پر یہی مطلع ہے
پہلے ایڈیشن (مطبوعہ نولکشور) کے صفحہ ۱۰۲ پر یہ مطلع ہے!

وہ سو رہا ہے اور کہتا رہا ہیں
اٹھو اور اٹھ کے باتیں کرو رات کم ہے

"گلکدہ" کا دوسرا ایڈیشن" ۱۹۳۱ء میں صدیق بکڈپو نے شایع کیا اس میں تعداد ذخائر میں اضافہ ہے۔ اس میں چودھری رحمت علی ہاشمی بی۔ اے کا پیش لفظ ہے اور اکبر آبادی مرحوم کا ایک شعر ہے۔

سخن میں یوں تو سب اہل تمیز ہیں فقط
شہید جلوہ معنی عزیز ہی کلام میں فقط

ڈاکٹر اقبال مرحوم کا خط بھی اسی میں ہے اور مولانا مفتی سید احمد علی صاحب مرحوم (فرزند حضرت علامہ مفتی میر عباس صاحب شوستری) کی ایک عربی نظم بھی مدح افکار عزیز میں ہے۔

میں نے ایک مرتبہ الہ آباد میں حضرت اکبر مرحوم سے پوچھا تھا کہ آپ نے عزیز کے متعلق صرف ایک شعر ہی پر کیوں اکتفا کی۔ فرمایا کہ "ایک ہی شعر طویل مضمون ہے"۔

دوسرا ایڈیشن نظامی پریس لکھنؤ میں چھپا تھا اس میں بعض مقامات پر کتابت کی غلطیاں ہیں۔

"انجم کدہ عزیز" یہ نام میرا ہی مجوزہ ہے۔ جب وہ (عزیز) راجہ محمد امیر احمد خاں صاحب (آف محمود آباد) کے استاد فارسی کی حیثیت سے محمود آباد ضلع سیتاپور میں مقیم تھے تو مجھے جائسی برابر خط لکھتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھے لکھا کہ بقیہ کلام جمع کر لیا ہے معہ مجموعہ تواریخ "مغفور" یعنی مولانا سید اولاد حسین صاحب شاداں بلگرامی کو رام پور بھیجوں گا تاکہ وہ اس پر علمی نظر ڈال لیں۔ اور خواہش کی کہ میں بھی دیکھ لوں! چنانچہ وفات سے چھ ماہ قبل شاداں مغفور کو یہ مجموعے بھیج دیئے تو جائسی نے مجھے بھی لکھ دیا کہ ان کے بعد میں بھی جلد دیکھ لوں۔ تاکہ میری زندگی میں طبع ہو جائیں کیونکہ ذیابیطس کا شدید حملہ ہے! شاداں مغفور نے یہ دونوں مجموعے بعد نظر مجھے بھیج دیئے۔ یہ میرے زیر نظر ہی تھے کہ سخت بیمار ہو گئے اور لکھنؤ آ گئے محمود آباد سے۔ مجھے بلا بھیجا میں پہنچا تو "بستر مرگ" پر تھے بات چیت مشکل سے کر سکتے تھے اور وہ بھی ادھوری۔۔۔۔۔ (ان کے بڑے فرزند ابو محمد سلمہ جو کم عمر تھے اس وقت موجود تھے) میں نے انھیں تسلی دی کہ آپ اچھے ہو جائیں گے اور سب مجموعے آپ کے سامنے طبع ہو جائیں گے انشاء اللہ۔

میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے کہ — ہاں -!

دوسرے دن اُن کا انتقال ہو گیا۔!

میں نے حضرت اثر صاحب کو جو اس وقت ڈیرہ دون میں کلکٹر تھے فوراً اطلاع دی۔ اور پوچھا کہ مجموعہ کلام جو میرے پاس برائے نظر آیا تھا اب کسے دیا جائے؟ انھوں نے تحریر فرمایا کہ یہ مجموعے عدالت لکھنؤ میں داخل کر دیجئے جو مستحق ہو گا اُسے مل جائیں گے۔؟ وجہ یہ تھی کہ اس کے مدعی تین تھے (۱) میر الطاف حسین صاحب عالم (عزیز کے بہنوئی) (۲) ابو محمد سلمہ (فرزند عزیز از زوجہ اولیٰ) (۳) حیات سلمہ (فرزند عزیز از زوجہ ثالثہ) میں بڑی کشمکش و پیچ میں پھنس گیا۔! المختصر میں نے تمام و کمال مجموعہ (معہ مقدمہ جو مرحوم کی خواہش کے مطابق لکھا تھا) شمس العلماء و مولوی سید ناصر حسین صاحب مجتہد مغفور کو رجسٹری سے بھیج دیا کہ آپ عالم دین ہیں جسے مستحق سمجھیں دیدیں! انھوں نے ورثاء کو بلایا مگر تصفیہ نہ ہو سکا! مجبور ہو کر انھوں نے مجھے لکھا۔

جناب محترم زادت مکارمکم السامیہ۔

بعد تسلیمات گزارش ہے کہ مجموعہ کلام عزیز مرحوم جو آپ نے میرے پاس بھیجا ہے بجائے خود امانتاً موجود ہے میں اس کو کسی شخص کے حوالے نہیں کر سکتا ہوں۔ آپ خود تشریف لا کر جس کو مناسب تصور فرمائیں اُس کو دیدیں۔ والسلام

ناصر حسین کُفِیَ عنہ بلقبہ

۱۶۔رجب ۱۳۵۴ھ

اس خط کے جواب میں پھر میں نے شمس العلماء کو لکھا کہ آپ خود جو چاہیں تصفیہ فرما دیں تاکہ مجھے خطوط ورثاء کی بھرمار سے نجات مل جائے!۔ تصفیہ پھر بھی نہ ہو سکا حتیٰ کہ مولانا بھی مغفور ہو گئے اور وہ مجموعہ کسی طرح راجہ محمد امیر احمد خاں صاحب (محمود آباد) کے کتب خانے میں پہنچ گیا جسے بعد تقسیم ہند عزیز مرحوم کے صاحبزادوں (ابو محمد سلمہ اور حیات سلمہٗ) نے راجہ صاحب سے حاصل کر لیا۔ چنانچہ وہ مجموعہ مع مقدمہ جناب مانی جائسی مرحوم طبع ہوا یعنی (انجم کدہ) میرا مقدمہ محذوف! ستم ظریفی یہ ہے کہ ابتدائے عبارت میں میرے متعلق یہ فقرہ بھی لکھ دیا گیا — "جناب اشہر صاحب شاگرد مصنف"! حالانکہ اسے حقیقت سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے۔! میرے اور عزیز کے دوستانہ، عزیزانہ اور معاصرانہ تعلقات تھے استادی یا شاگردی کا کوئی سوال ہی نہیں! اکثر ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ کسی خاص مشاعرے کے ایک روز قبل ہم پانچ آدمی یعنی عزیز مرحوم۔ نواب جن صاحب بلیغ مرحوم۔ سید محمد صاحب بہار۔ علی حسن خاں اثر مرحوم (ایڈیٹر معیار) اور میں۔ بہار مرحوم کے مکان (گنگنی شکل کے تالاب) پر جمع ہوتے تھے اور قافیہ وار طرحی غزل کا ہر شعر کہتے تھے اور ایک دوسرے کو سناتے جاتے تھے۔ اگر کسی نے کوئی معقول تجویز بلحاظ الفاظ پیش کی تو اس پر غور کیا جاتا تھا اور حسب ضرورت ردوبدل بھی کی جاتی تھی۔ ایک شب ہم سب جمع ہوئے اور اس طرح پر اشعار کہہ کر ایک دوسرے کو سنانے لگے۔ طرح تھی۔

رنگ بدلا ہے بہار آتے ہی سودائی کا

اسی طرح میں عزیز مرحوم کا مشہور شعر ہے۔

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

بلیغ نے اسی قافیہ کو کہا تھا۔

صبح کا وقت تھا کیا وہ حسین لمحہ تھا
آج تک یاد ہے عالم تری انگڑائی کا

بہار نے کہا۔

وہ جوانی کی کشش تھی کہ الٰہی توبہ
میں نے دیکھا ہے سماں آپ کی انگڑائی کا

اثر مرحوم کا شعر تھا۔

حسن بیباک سے کونین کا دل جھوم اٹھا
ہو گیا مست سماں دیکھ کے انگڑائی کا

اور میرا شعر —

آسماں پر کہیں لہرائی جو رنگین دھنک
کھنچ گیا آنکھ میں نقشہ تری انگڑائی کا

عزیز مرحوم نے اپنا مندرجہ بالا مشہور شعر جب سنایا تو اس میں "مرکز" کی جگہ لفظ "جسم" تھا۔ میں نے کہا "جسم" کے

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

غزل

احترام الدین شاغل

رسائی اہلِ میخانہ کی کیا کہیے کہاں تک ہے
کسی کی آسماں تک ہے کسی کی لامکاں تک ہے
مرے مشرب کی وسعت کیا بتاؤں میں کہاں تک ہے
ادھر شیخِ حرم تک ہے ادھر پیرِ مغاں تک ہے
نہ داغِ دل ہی رشکِ جنت الفردوس ہیں اپنے
بہارِ گلستانِ عشق چشمِ خونچکاں تک ہے
کرشمہ کیا ادا کیا ناز کیا انداز و عشوہ کیا
ہماری جان کا خواہاں تو اُن کا پاسباں تک ہے
ہوا کیسی بلندی ہے دیکھیے اور بانگ اپنی
رسائی دیر و کعبہ کی تمہارے آستاں تک ہے
ادب کی معرکہ آرائیاں ہیں بزمِ عالم میں
ادارہ لشکرِ اردو کا حدِ اصفہاں تک ہے
خدا رکھے ابھی کچھ ہے ابھی تو خانۂ دل میں
خلش ہے درد ہے تڑپا ہے درد و فغاں تک ہے
جوابِ حشر کیا دوں اب فرشتوں کو یہ کیا سوجھی
مرے اعمال نامہ میں بھی اردو زباں تک ہے
ہمیں بھی کوثر و تسنیم کا چسکا ہے اے شاغل
ہماری بھی رسائی اب فرشتوں کی زباں تک ہے

غزل

جے کرشن چودھری حبیب

کبھی طویل کبھی مختصر بھی ہوتی ہے
ہر ایک رات کی لیکن سحر بھی ہوتی ہے
رخِ نگار کی رنگینیاں نکھر آئیں
نگاہِ شوق کبھی بے اثر بھی ہوتی ہے
مجھے ازل سے ملا ایک تو مزاجِ جنوں
اور اک ادا تری دیوانہ گر بھی ہوتی ہے
نگاہِ یار نے بھی گل کھلائے ہیں کیا کیا
[illegible] چارہ گر بھی ہوتی ہے
نقابِ دوست کبھی گیسوئے عزیز ہوتے ہیں
کرم کی اس میں کبھی اک نظر بھی ہوتی ہے
حبیب آنکھ سے ٹپکی ہوئی یہ اشک کی بوند
جگر کا خون کبھی یہ گہر بھی ہوتی ہے

دو شعر

خورشید احمد شمسی

غم کی شام کے سائے کس قدر گھنیرے ہیں　　ہر طرف سے تاریکی ہر طرف اندھیرے ہیں
کس کی زلف لہرائی کون آج یاد آیا　　میرے دل کے گلشن پہ گیسوؤں کے ڈیرے ہیں

ہندستانی فلمیں اور اردو

بمبئی میں تیار ہونے والی فلمیں جنھیں سنسر بورڈ کے سرٹیفکیٹ میں ہندی فلمیں کہا جاتا ہے دراصل اردو یا ہندستانی زبان کی فلمیں ہوتی ہیں جن میں پنڈتوں کی شدھ ہندی نہیں بلکہ ملک کے تمام حصوں کی ملی جلی آسان اور عام فہم زبان ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ یہ فلمیں کشمیر سے کنیا کماری تک اور کلکتہ سے حیدرآباد تک دیکھی جاتی اور یکساں طور پر پسند کی جاتی ہیں۔

ہندستانی فلموں میں اردو کا یہ چلن کوئی نئی بات نہیں البتہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ زبان کے انداز میں بھی تبدیلی آتی گئی اور وہ زیادہ عام فہم و آسان بن گئی۔ آغا حشر کاشمیری کے رنگ کی بامحاورہ اردو اور تھیٹریکل انداز کے مکالموں کا دور اب گزر چکا ہے۔ اس کے بجائے اب راجندر سنگھ بیدی، اختر الایمان، ورجیندر گوڑ، راجندر کرشن آسان اور ہر ایک کی سمجھ میں آنے والی زبان میں مکالمے لکھتے ہیں۔

بنگال میں بننے والی فلمیں جو فن اور معیار کے لحاظ سے بہت اچھی ہوتی ہیں یا مدراس میں بننے والی فلمیں، جو اپنے ڈرامائی عنصر یا سستی جذباتیت کی بنا پر زیادہ پسند کی جاسکتی ہیں، آج اتنی مقبول نہیں ہیں جتنی کہ بمبئی میں بننے والی ہندستانی فلمیں۔ بنگال اور مدراس کی فلمیں محدود علاقے اور مخصوص ذوق والے ہی پسند کرتے ہیں جب کہ بمبئی کی ہندستانی فلمیں سارے ملک میں دیکھی اور پسند کی جاتی ہیں اور اس کی سب سے بڑی وجہ ہے ان فلموں کی آسان اور عام فہم اردو زبان۔

یہ اس زبان کی کشش اور مقبولیت ہی ہے کہ ابتدائی دور میں حضرت آرزو لکھنوی اور جوش ملیح آبادی و سعادت حسن منٹو سے لے کر آج اردو کے بہت سے ممتاز شاعروں اور ادیبوں کو ہندستانی فلموں نے اپنایا ہے۔ سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی، شاہد لطیف، راجندر سنگھ بیدی، کیفی اعظمی، [illegible]، مجروح سلطانپوری، اختر الایمان، ساحر لدھیانوی اور دوسرے [illegible] ہیں جو آج ہندستانی فلموں کے لیے مکالمے اور گیت لکھ رہے ہیں جو نہ صرف سارے ملک میں مقبول ہوتے ہیں بلکہ بچے بچے کی زبان پر آجاتے ہیں۔ [illegible] بعض اوقات اس بات کی کوشش کی گئی کہ سیدھی سادی اور عام فہم زبان کے بجائے پنڈتوں کی ہندی اور سنسکرت آمیز زبان کو اپنی فلموں میں استعمال کیا جائے لیکن ان کی [illegible] اس بات کا ثبوت ہے کہ اس ملک کے عوام سیدھی سادی اور عام فہم زبان پسند کرتے ہیں چاہے اس زبان کو آپ اردو کا نام دیجیے یا ہندستانی کا اور چاہے سنسر کے سرٹیفکیٹ پر آپ ہندی لکھ دیجیے۔

(ہفتہ وار حیات)

پریم پال اشک

سرشار کی چند تصانیف

سیر کہسار یعنی فسانۂ لطیف:۔

یہ بات تو صحیح ہے کہ اس زمانے میں ایک کتاب کے دو دو نام رکھنے کا رواج تھا۔ اور سرشار نے بھی یہی طریقہ اپنایا۔ فسانۂ آزاد کے بعد سرشار کے دو ناول ہیں جن پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے وہ ہیں سیر کہسار اور جام سرشار۔

گو سیر کہسار کا پہلا ایڈیشن مطبوعہ (۱۸۹۰ء) اب کمیاب ہے لیکن یہ ناول فسانۂ لطافت یا دہ کے نام سے نہیں بلکہ فسانۂ لطیف کے زیر عنوان اودھ اخبار میں بالاقساط شائع ہوا۔ اس کی تصویریں سیر کہسار کی دوسری جلد کے آخر میں درج تقریظات سے ہو جاتی ہے۔

جام سرشار

جام سرشار کی تقریظات کے مطالعہ سے ایک بڑی دلچسپ بات منظر عام پر آتی ہے۔ یہ ناول فسانۂ جدید کے زیر عنوان اودھ اخبار میں، فسانۂ آزاد کے ساتھ ساتھ چھ ماہ تک بالاقساط شائع ہوتا رہا جیسا کہ عالی جناب پنڈت مادھو پرشاد صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر و اکسٹرا اسسٹنٹ ملک مغربی و شمالی اودھ، سرشار کی مشہور و معروف تصنیف جام سرشار کی تقریظ میں فرماتے ہیں۔

"فسانۂ جدید کے نام سے ایک ناول مصنفہ پنڈت رتن ناتھ صاحب سرشار سابق ایڈیٹر اودھ اخبار بقید زمانہ اخبار مذکور کے ساتھ چھ مہینے تک شائع ہوا تھا۔ گو دو ناولوں کا ایک ساتھ لکھنا بڑے بیدار مغز منشی کا کام ہے۔ اور پنڈت رتن ناتھ صاحب نے فسانۂ آزاد کے ساتھ ساتھ یہ ناول بھی عمدہ طرز سے لکھا اور شائع کیا تھا لیکن ناظرین نے فسانۂ جدید کی بھی قدر مقدور کی کہ کتاب ہاتھوں ہاتھ بک گئی اور بعض سے خرید کر محروم رہے۔

لہٰذا مکرمی منشی نولکشور صاحب نے مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ پنڈت رتن ناتھ صاحب فسانۂ جدید کی نظر ثانی کریں۔ تاکہ فسانۂ مذکور از سر نو کتاب نما قالب میں اشاعت پائے۔

پنڈت صاحب نے اس ناول کی ترمیم اور نظر ثانی میرے ساتھ ساتھ کی۔ اور اس کے اکثر حصے بدل دئے۔ اور حشو و زوائد کو دور کر کے ایک نئے پیرایہ میں ناول لکھا اور اس کا نام جام سرشار رکھا۔"

اس تقریظ سے سرشار کی جدت طبع پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ فسانۂ جدید اور فسانۂ آزاد ان دونوں ناول کا مزاج جداگانہ ہے۔ اول الذکر سماجی ناول ہے اور آخر الذکر مزاحیہ۔ ان دونوں کے کردار بھی آپس میں کہیں لگا نہیں کھاتے۔ لیکن اس کے باوجود دو متضاد دھاروں کو ایک ہی رو میں بہا دینا سرشار ہی کا حصہ ہے۔

شمس الضحیٰ:۔

یہ تصنیف پنڈت رتن ناتھ سرشار کے زور قلم کا نتیجہ ہے یہ کتاب ۱۸۷۸ء میں نول کشور پریس سے شائع ہوئی۔ اس وقت سرشار چھیم پور ضلع کھیری میں مدرس تھے۔

شمس الضحیٰ ارض و سما یعنی جغرافیہ طبعی سے متعلق انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہے۔ یہ کتاب چار حصوں میں منقسم ہے۔ انھیں چار کرّے قرار دیا گیا ہے پہلے کرہ میں زمین کی گردش اور شکل بیان کی گئی ہے اس میں انیس اقمار ہیں۔

دوسرا کرہ نظام شمسی سے متعلق ہے۔ اس میں چاند سورج ستارے اور دیگر اجرام پر بحث کی گئی ہے۔ اس میں کل ۱۹ اقمار ہیں۔

تیسرا کرہ، کرۂ ارض کے اجسام اور حجم سے تعلق ہے۔ اس میں زمین کی شکل و صورت، خشکی، دریا اور پہاڑوں وغیرہ کے بارے میں واقفیت بہم پہنچائی گئی ہے۔ اس میں چار اقمار ہیں۔

چوتھے کرہ میں انسان اور اس کی نسلوں کے بارے میں معلومات دی گئی ہیں۔ اس میں ایک ہی قمر ہے۔

طرز بیان شگفتہ اور برجستہ ہے۔ اشعار کے برمحل استعمال نے ترجمہ کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ دیباچہ میں مسرور کا انداز غالب ہے۔

اعمال نامۂ روس:۔

یہ میکنزی والیس کی شہرۂ آفاق تصنیف Russia کا اردو ترجمہ ہے یہ کتاب رائل سائز کے سوا چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر میکنزی والیس ایک انگریز سیاح تھے۔ آپ چھ سال تک روس میں رہے۔ جہاں آپ نے روسی طرز زندگی کا گہرا مطالعہ اور مشاہدہ کیا ۱۸۷۶ء میں اپنے وطن لوٹ کر انھوں نے یہ کتاب لکھنی شروع کی۔ جو ۱۸۷۷ء میں، روسیوں اور ترکیوں کے مابین جنگ کے چھڑنے پر منظر عام پر آئی یہ کام اردو زبان میں منظر عام پر اس وقت آیا کہ جب سرشار اودھ اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا لہٰذا ۱۸۹۲ء میں نول کشور پریس کی طرف سے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔

یہ ایک سفر نامہ ہے جس میں روسیوں کے سماجی تہذیبی مذہبی اور سیاسی نظام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساری کتاب پر از معلومات ہے۔

ترجمہ کی صلاحیت کا اندازہ منشی نول کشور کے اس اقتباس سے ہو جاتا ہے یہ ایک خط کا اقتباس ہے جو منشی نول کشور نے

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

مراسلات

ماہنامہ "انتخاب" لاہور

۸ مئی ۶۵ء کے ہماری زبان میں اختر شیرانی کے پرچے "انتخاب" پر نادم سیتاپوری صاحب کا ایک تعارفی مضمون شائع ہوا ہے۔ پرانے رسائل کا تعارف کرانا دراصل کمیاب مواد کو روشنی میں لانا ہے۔ اس طرح تحقیق کے لیے خام مواد فراہم ہو جاتا ہے لیکن بعض حضرات اس تعارف کو تحقیق کا رنگ دینے لگتے ہیں اور اس لایعنی کوشش میں ایسی فاش غلطیاں کرتے ہیں کہ تحقیق کرنا تو درکنار دوسرے کام کرنے والوں کے لیے دشواریاں پیدا کر دیتے ہیں۔ نادم صاحب کا مضمون اسی قسم کی تحقیق کا مظہر ہے۔ تحقیق میں غلطیاں ہونا فطری بات ہے لیکن غلطیوں کی قاموس مرتب کرنے کو تحقیق نہیں کہا جا سکتا۔ کسی رسالہ کا ایک شمارہ ہاتھ آ جانے پر ظن و تخمین اور غلط اندازوں کی بنیاد پر تحقیق کی عمارت کھڑی کر دینا کسی طرح صحیح نہیں کہا جا سکتا۔

اختر صاحب کے بارے میں نادم صاحب رقمطراز ہیں:۔

"یقین کے ساتھ کچھ کہنا دشوار ہے لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں ماہنامہ "بہارستان" (لاہور) پہلا ادبی ماہنامہ تھا جس سے ان کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا۔ بہارستان ۱۹۲۳ء میں لاہور سے جاری ہوا مگر نہ جانے کیا ہوا کہ انھیں جلد ہی اس ماہنامے سے علیحدہ ہونا پڑا، لیکن اختر کی یہ علیحدگی بہت دنوں تک باقی نہیں رہ سکی" (ہماری زبان ۸ مئی ۶۵ء ص ۷)

دیکھا آپ نے تعارف "انتخاب" کے پہلے شمارے کا کراتے ہیں لیکن زیر بحث اختر کی پوری صحافتی زندگی آ گئی ہے۔ اور مواد کا یہ عالم ہے کہ "انتخاب" لاہور (اکتوبر ۱۹۲۲ء) اور "بہارستان" لاہور (اگست ۱۹۲۵ء) صرف دو شمارے پیش نظر ہیں۔ اس مواد کی بنیاد پر جو دعوے کیے جائیں گے ان کی حقیقت معلوم!

واقعہ یہ ہے کہ اختر کی صحافتی زندگی کا آغاز ۱۹۲۲ء سے[1] ہوا جب وہ رسالہ "ہمایوں" لاہور کے مدیر معاون مقرر ہوئے۔ اس سلسلے میں خود اختر کا بیان موجود ہے[2] "بہارستان" ۱۹۲۳ء میں جاری نہیں ہوا۔ نادم صاحب نے اگست ۱۹۲۵ء کے شمارے پر جلد ۳ شمارہ ۲ لکھا دیکھ کر تین سال کا حساب لگایا اور خواہ مخواہ اسے ۱۹۲۳ء سے جاری کرا دیا۔ حالانکہ "بہارستان" ۱۹۲۴ء سے نکلنا شروع ہوا[3]۔ اس کی پہلی جلد ۸ شماروں پر مشتمل تھی اور باقی جلد ۶ شماروں کی تھیں[3]۔ میرے پاس "بہارستان" کی دو جلدیں موجود ہیں۔

"بہارستان" سے اختر کی علیحدگی بھی عارضی نہیں تھی۔ نادم صاحب نے خود اختر کا قول نقل کیا ہے کہ "اب مسئولیت کا دُم چھلا میرا پیچھا چھوڑ دے گا اور برائے نام نگرانی کی خدمات میرے سپرد ہوں گی" اور یہ نگرانی بھی انھوں نے اپنے دوست نازش رضوی کے اصرار پر قبول کی تھی[1]۔ ان کی علیحدگی کے بعد بہارستان زیادہ دنوں جاری نہیں رہ سکا۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔ "ماہنامہ "انتخاب" (لاہور) اختر شیرانی کی ادارت میں اسی زمانے میں نکلا تھا جب وہ بہارستان سے کچھ دور ہو گئے تھے" دراں حالیکہ "انتخاب" "بہارستان" سے پہلے جاری ہو چکا تھا اور "انتخاب" کے بند ہونے کے بعد "بہارستان" جاری ہوا۔ خدا جانے اس دعوے کے لیے صاحب موصوف کو دلیل کہاں سے مل گئی اور آخر یہ بے بنیاد بات انھوں نے کیونکر کہہ دی۔ "انتخاب" اکتوبر ۱۹۲۲ء سے نکلنا شروع ہوا اور مارچ ۱۹۲۳ء تک نکلتا رہا۔ فروری مارچ ۱۹۲۳ء کا مشترکہ شمارہ "انتخاب" کا آخری شمارہ تھا[2]۔ اسی شمارہ میں اختر نے اعلان کیا تھا کہ چونکہ انتخاب مضامین کے طریقے (DIGEST) کو لوگوں نے عام طور پر پسند نہیں کیا ہے اس لیے آئندہ ماہ سے "انتخاب" بہارستان کی شکل میں نکلے گا اور اس میں تازہ بتازہ نو بنو مضامین ہوا کریں گے[3]۔ بہارستان کو اس حساب سے ۱۹۲۳ء میں نکلنا چاہیے تھا مگر انتظامی دشواریوں کے پیش نظر یہ ممکن نہ ہو سکا اور بہارستان کا پہلا شمارہ مئی ۱۹۲۴ء سے منظر عام پر آیا۔

اسی مضمون میں نادم صاحب نے اختر کے والد کو "ڈاکٹر محمود شیرانی" لکھا ہے۔ حافظ محمود شیرانی کو ڈاکٹریٹ کا اعزاز کب حاصل ہوا۔ یہ بات ہمارے علم میں نہیں۔ پہلی بار ان کے نام کے ساتھ "ڈاکٹر" لکھا ہوا دیکھا ہے۔ اگر نادم صاحب اپنے ذریعہ علم سے مطلع کریں تو یقیناً یہ بات علم میں اضافہ کا باعث ہو گی۔ (یونس حسنی)

"ہماری زبان" کے مندرجہ ذیل شمارے درکار ہیں۔

۸ جنوری ۱۹۶۳ء
۱۵ " "
۲۲ " "
یکم فروری "

اگر کسی صاحب کے پاس یہ شمارے موجود ہوں تو روانہ کرکے شکریہ کا موقع دیں۔ تاکہ فائل مکمل ہو سکے۔

اکرام احمد ایس ۲/۳۶۳ سعود آباد ملیر کراچی

———x———

[1] اردو کی گل از ضمیر ہاشمی ص ۶۳
[2] بہارستان لاہور مئی ۱۹۲۴ء ص ۱
[3] بہارستان لاہور دسمبر ۱۹۲۴ء ص ۲

[1] بہارستان اگست ۱۹۲۵ء ص ۴
[2] انتخاب لاہور فروری مارچ ۱۹۲۳ء ص ۹
[3] " " " "

اردو کو یوپی کی دوسری علاقائی سرکاری زبان تسلیم کیا جائے

صدر جمہوریہ کو پیش کیے جانے والے میمورنڈم کی تفصیل

نئی دہلی (بذریعہ ڈاک) اترپردیش اسمبلی اور کونسل کے ۴۰ ممبروں کے دستخطوں پر مشتمل جو میمورنڈم جمعہ کے دن یہاں مسٹر جمیل الرحمٰن قدوائی ایم۔ ایل۔ اے۔ اور مولانا عبد الرؤف ایم۔ ایل۔ اسی نے صدر جمہوریہ کو پیش کیا۔ اس کا متن ذیل میں دیا جا رہا ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ صدر نے میمورنڈم پر ہمدردانہ غور و خوض کا یقین دلایا ہے۔

"ممبران مجالس قانون ساز اترپردیش آپ کی توجہ مندرجہ ذیل امور کی طرف مبذول کرانے کی اجازت چاہتے ہیں۔

(۱) اترپردیش کے تمام شہریوں نے بشمول ان تمام شہریوں کے کہ جن کی زبان ہندی ہے۔ دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی ہندی زبان کو ہندستان کی سرکاری زبان تسلیم کر لیا ہے۔

(۲) ہماری ریاست میں سرکاری زبان اتنی ناقابل فہم اور مشکل ہوتی جا رہی ہے کہ اس کو ہندی مادری زبان والے بھی پورے طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ حالانکہ آئین ہند کی دفعہ ۳۵۱ نیز گورنمنٹ کے احکامات اور گشتی چٹھیاں اس امر کی ہدایت کرتی ہیں کہ عام الفاظ اور اصطلاحات استعمال کی جائیں۔ ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے اور بجائے ہندستانی عام فہم اور اردو کے الفاظ کے مشکل سنسکرت الفاظ کا استعمال بہت تیزی سے ہو رہا ہے۔

(۳) چونکہ اترپردیش کے کثیر التعداد شہریوں کی مادری زبان اردو ہے۔ یہ زبان اس ملک میں پیدا ہوئی اور پھلی پھولی ہے اور ۱۹۴۷ء تک یہی زبان بہت سے سرکاری کاروبار میں استعمال ہوتی تھی اور اس کو علاقائی زبان کا رتبہ حاصل تھا۔ علاوہ ازیں اس زبان نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں قابل تعریف اور نمایاں حصہ لیا ہے۔

(۴) چونکہ اترپردیش میں صرف ہندی ہی سرکاری زبان تسلیم کی گئی ہے اس لیے ہم میں سے بہت سے ممبروں کے لیے یہ امر بہت ہی مشکل ہو گیا ہے کہ ہم بحیثیت پبلک کے نمائندے کے اپنے فرائض قابل اطمینان طور پر ادا کر سکیں اور مجالس قانون سازی کی کارروائیوں میں مناسب حصہ لے سکیں۔

(۵) اردو ہندوستان کی چودہ قومی زبانوں میں سے ایک قومی زبان ہے اور اس ملک کے سوا دو کروڑ باشندے یہی زبان بولتے ہیں۔ اس کو ہندوستان کی زبانوں میں پانچواں درجہ حاصل ہے۔ اور دنیا کی زبانوں میں بھی اس کا بیسواں درجہ ہے۔

اترپردیش کی مردم شماری کے اعداد میں اردو بولنے والوں کی تعداد ۷۰ لاکھ ظاہر کی گئی ہے جو بہت سے ذمہ دار اشخاص اس تعداد کو صحیح نہیں سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ یہاں اردو مادری زبان والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے مگر مردم شماری میں اس کو کم کر کے دکھایا گیا ہے۔

(۶) انسان اپنی مادری زبان میں ملک کی بہترین خدمات انجام دے سکتا ہے اور ایک غیر مذہبی جمہوری ریاست کے مقاصد اس وقت تک پورے نہیں ہو سکتے جب تک ہر شہری کو ایسے مساوی مواقع نہ دئے جائیں کہ جن میں ان کی تمام قابلیتیں مکمل طور پر نشو و نما پا سکیں۔

(۷) اگر اترپردیش میں اردو دوسری سرکاری علاقائی زبان نہ تسلیم کی گئی تو ریاست کے کثیر التعداد شہری گھاٹے میں رہیں گے۔ کیونکہ وہ قومی ترقی کی اسکیموں میں موثر طریقے سے حصہ نہیں لے سکیں گے۔ اور بطور اول درجے کے شہریوں کے اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریاں ادا نہ کر سکیں گے کیونکہ سرکاری زبان کے علم کی ناواقفیت کی وجہ سے وہ نہ تو خود منصوبہ بندی کی تجاویز کو سمجھ سکیں گے نہ ان تجاویز کو عوام میں ہر دلعزیز بنا سکیں گے۔

(۸) عوام سے تعلق قائم کرنے اور ان میں خیالات پھیلانے میں اردو زبان کی اہمیت اور افادیت کا اس امر سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اترپردیش کی تمام سیاسی اور غیر سیاسی پارٹیاں اور ادارے بشمول جن سنگھ . . . .

. . . . . اردو زبان میں ہی اپنے اصولوں اور پروگراموں کی اشاعت کرتی ہیں۔

(۹) ہماری رائے ہے کہ اگر اترپردیش میں اردو کو دوسری سرکاری یا علاقائی زبان تسلیم کر لیا گیا تو اس سے قومی اتحاد کی تحریک میں بہت مدد ملے گی اور ہماری نوخیز جمہوری ریاست کی طاقت بڑھے گی۔

(۱۰) ۱۹۵۱ء سے کہ اب تک اترپردیش کے اردو مادری زبان والے شہری اردو کو اس ریاست میں اس کا جائز مقام دلانے کے لیے جد و جہد کرتے رہے ہیں۔ محترم جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صدارت میں ایک وفد ۲۲ لاکھ باشندوں کے دستخطوں کی درخواست لے کر اس وقت کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد آنجہانی کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اور اس نے اردو کے بارے میں مطالبات پیش کیے تھے مگر درخواست کے بارے میں ابھی تک سرکار کی طرف سے کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا۔

(۱۱) ہمارے عظیم قومی رہنما مہاتما گاندھی اور مسٹر نہرو کی بھی یہ رائے تھی کہ فارسی رسم الخط میں لکھی جانے والی اردو کو بھی بطور دوسری علاقائی زبان کی شکل میں قائم رکھا جائے۔

(۱۲) جبکہ غیر ہندی ریاستیں ایک لمبے عرصے کے لیے دو لسانی ریاستیں رہیں گی تو کوئی وجہ نہیں کہ اتر پردیش کے بھی دو لسانی ریاست ہونے کا اعلان نہ کیا جائے، یعنی ہندی کے ساتھ اردو کو بھی بجائے انگریزی کے دوسری سرکاری زبان تسلیم کیا جائے۔

مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر ہم نہایت ادب سے درخواست کرتے ہیں کہ اتر پردیش میں آئین ہند کی دفعہ ۳۴۷ کے مطابق اردو زبان کو بھی دوسری سرکاری اور علاقائی زبان کا رتبہ دیا جائے۔ (سیاست جدید)

اردو کے سلسلے میں آندھرا پردیش کے وزیر داخلہ کا اعلان

حیدر آباد۔ وزیر داخلہ نواب میر احمد علی خاں نے کہا کہ حکومت آندھرا پردیش نے اردو کو علاقائی زبان کی حیثیت دے دی ہے اور اس خصوص میں احکام نافذ کیے ہیں۔ احکام کی عمل آوری میں کہیں کوتاہی برتی جا رہی ہو تو اس کو حکومت کے علم میں لایا جائے تاکہ ضروری کارروائی کی جا سکے۔ وزیر داخلہ جو انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے صدر بھی ہیں۔ ۱۰ اپریل کو انجمن ترقی اردو شاخ گنگل ضلع اننتا پور کا افتتاح کر رہے تھے۔

محبان اردو کے ایک کثیر مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو سارے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اردو ایک ترقی یافتہ زبان ہے جہاں تک آندھرا پردیش کا تعلق ہے حیدر آباد شہر اردو کے معاملات میں سرفہرست ہے لیکن ریاست میں اردو کی ترقی کا پیمانہ حیدر آباد شہر ہی نہیں ہوگا بلکہ اس کے اضلاع بھی ہوں گے اور جب تک تلنگانہ کے اضلاع کے ساتھ کڑپہ اور کرنول۔ اننت پور۔ نیلور اور اضلاع شمالی میں اردو ترقی نہ کرے اردو کی ترقی کو مکمل نہیں کہا جا سکتا اس لیے شہر گنگل میں انجمن ترقی اردو کی شاخ کا قیام اور اردو کی خدمت کے لیے اہالیان گنگل کا جوش ایک نہایت ہی امید افزا اقدام ہے۔ آندھرا پردیش کے عوام اور حکومت کو تلگو کے ساتھ ساتھ اردو سے بھی دلچسپی ہے اور سب اردو کی ترقی کے خواہاں ہیں، اس پر ہمیں فخر ہے۔ حکومت آندھرا پردیش نے اردو کو علاقائی زبان قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں ضروری احکامات صادر کر دیے ہیں۔ ان احکامات پر پوری طرح عمل کیا جائے گا۔ (نامہ نگار)

اردو زبان کی بقا ابتدائی اسکولوں میں اس کی تعلیم پر منحصر ہے

لکھنؤ یکم جون۔ صدر انجمن ترقی اردو پنڈت آنند نرائن ملا (سابق جج ہائیکورٹ) نے ریاست اتر پردیش کی تمام ضلعی اور شہری شاخوں کے نام ایک ہدایت نامہ جاری کرتے ہوئے انھیں اس بات کی طرف متوجہ کیا ہے کہ اردو زبان کی بقا اس بات پر منحصر ہے کہ ابتدائی درجوں میں سرکاری اسکولوں میں مادری زبان اردو بتانے والے بچوں کو اردو میں تعلیم ملے اور اس کی جدوجہد انجمن ترقی اردو کی تمام شاخوں کو ابھی سے شروع کر دینا چاہیے کیونکہ جولائی سے تعلیمی سال شروع ہوتا ہے، ہر اسکول میں زیادہ سے زیادہ لڑکوں کو داخل کرایا جائے اور ان کے سرپرستوں کی درخواستیں اسکولوں کے سربراہوں کو دی جائیں اور اسکولوں کے ڈکلریشن فارم کارکنان اپنی موجودگی میں بھروائیں اور داخل کرائیں اور کسی اسکول کے سربراہ حیلے کریں تو ان سے باقاعدہ تحریر حاصل کی جائے۔ پنڈت جی نے تاکید کی ہے کہ جو آسانیاں حکومت سے حاصل ہیں ان سے پورا فائدہ اٹھایا جائے اور اس کام کو ایک مہم کی صورت میں کیا جائے۔ (الجمعیۃ)

پنڈت نہرو کی یاد میں بزم فروغ ادب بھوپال کا مشاعرہ

بھوپال۔ ۲۹ مئی کو ۱۰ بجے شب میں بزم فروغ ادب بھوپال رسکیٹر نکلیس بھوپال کی جانب سے محبوب رہنما آنجہانی پنڈت نہرو کی یاد میں محفل مشاعرہ بمقام منگلوارہ منعقد ہوئی جس کی صدارت مشہور صحافی جناب ایم۔ عرفان نے کی۔ مشاعرہ کی ابتدا سے پہلے صدر موصوف نے اپنی مختصر سی تقریر میں آنجہانی نہرو کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا: "آج پنڈت نہرو کی موت کو ایک سال کا عرصہ ہو گیا ہے اور ہم ان کا ہفتہ منا رہے ہیں۔ پنڈت نہرو کی شخصیت کے ایک ایسے پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں جس کا تعلق اردو سے ہے اور جس پہلو کے بارے میں خاموشی اختیار کر لی گئی ہے۔ اس ذیل میں دو واقعات بیان کروں گا... پنڈت نہرو نے ایک مرتبہ بتایا کہ انھوں نے اردو کسی اسکول میں نہیں پڑھی لیکن جو پہلا لفظ ان کے کان میں پڑا وہ اردو کا تھا۔ ان کے گھر میں سب ہی اردو بولتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اردو گھر میں سیکھی۔ دوسرا ۱۹۵۸ء میں انجمن ترقی اردو کے کنونشن کے موقع پر تقریباً پچاس ہزار اردو والوں کے اجتماع میں انھوں نے کہا تھا کہ اردو کو اس کا حق دلانے کے وہ بھی خواہش مند ہیں۔ اردو ان کی مادری زبان ہے... جس سے متاثر ہو کر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے پُر زور انداز میں فرمایا تھا کہ اب اردو کے شیدائیوں کو بے فکر رہنا چاہیے

کہ ملک کے وزیر اعظم اس کے بولنے والے اور اس کا حق دلانے والے ہیں۔ اس کے باوجود افسوس ہے کہ اس سلسلہ میں کچھ نہ کیا گیا۔ یہاں میرا مقصد اردو کی بات کرنا نہیں ہے مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جس زبان کی حق طلبی کے لیے لاکھوں دستخطوں کا میمورنڈم پیش کیا گیا ہے۔ جس کے لیے ۲۰۰ ممبران پارلیمنٹ نے دستخطی یادداشت پیش کی اس کا حق نہ دینا کہاں کا انصاف ہے۔ آج اس موقع پر اگر اردو کا حق تسلیم کرلیا جائے ...." بعدہٗ مشاعرہ کا آغاز جناب فضل تابش کی نظم سے ہوا۔ حضرات وکیل بھوپالی۔ حمید قریشی۔ مقصود عمرانی۔ عشرت قادری۔ وفا صدیقی۔ رفعت الحسینی۔ سلطان حیدر حیدری۔ قاسم نیازی۔ واحد علی بانکے۔ شفق بھوپالی۔ خاں بھوپالی۔ انصار انظر۔ ظفر صہبائی۔ مظفر نعیمی وغیرہ شعراء کرام نے اپنے کلام سے آنجہانی نہرو کو خراج عقیدت پیش کیا اور سامعین کو محظوظ فرمایا۔ اختتام مشاعرہ سے قبل جناب نر تاباں نے ان حضرات کا شکریہ ادا کیا۔ جن کی کاوشوں سے مشاعرہ کامیاب رہا۔　　(رضی مجیدی۔ سکریٹری نشر و اشاعت)

غالب سینٹینری کمیٹی کی میٹنگ

غالب سینٹینری کمیٹی کی ایک میٹنگ ۷ر مئی ۶۸ کو مولانا آزاد روڈ، دہلی میں ہوئی۔ اس میٹنگ میں ڈاکٹر ذاکر حسین (صدر کمیٹی)، جناب احمد محی الدین (سکریٹری کمیٹی) اور اراکین کمیٹی پروفیسر ہمایوں کبیر ڈاکٹر گوپال ریڈی، کرنل بشیر حسین زیدی، حمیدہ سلطان صاحبہ اور مالک رام صاحب نے شرکت کی۔

پچھلی میٹنگ کی روداد کی توثیق کے بعد سکریٹری نے ان خطوں کے جواب سنائے جو کمیٹی کی طرف سے مختلف ریاستوں کو غالب سینٹینری منانے کے سلسلے میں لکھے گئے تھے۔ اپنے جوابات میں بیشتر ریاستوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس خاص موقع کے لیے پروگراموں کی ترتیب میں غالب سینٹینری کی مرکزی کمیٹی ان کی رہنمائی کرے۔

طے کیا گیا کہ ہر ریاست اس موقع پر ایک مشاعرہ، غالب پر ایک سیمنار، اور غالب پر ایک کتاب شایع کرے، اور کوسٹر کی نظم کی نمائش کرے اور غالب کی غزلوں کے گراموفون ریکارڈ اور پوسٹ کارڈ تیار اور فروخت کرے۔

مرکزی کمیٹی غالب کی اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریروں کی اور غالب کے معاصرین کی ایسی تحریروں کی جو ان سے متعلق ہیں، کی ایک نمائش کرے۔ اس مقصد کے لیے ایک فہرست تیار کی جائے اور کمیٹی اس سلسلے میں پورا تعاون کریں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے رائے دی کہ غالب کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی منتخب غزلیں یا دوسری تحریریں غالب کے فوٹو کے عکس کے ساتھ پوسٹ کارڈوں پر شایع کی جائیں اور ان کو اس موقع پر کم قیمت میں فروخت کیا جائے۔

یہ بھی طے پایا کہ حکومت سے اس موقع پر ایک ڈاکومینٹری فلم بنانے کی درخواست کی جائے۔

حمیدہ سلطان صاحبہ نے کہا کہ دہلی میونسپل کارپوریشن کو چاہیے کہ وہ غالب کے مکان کو، جو کہ بلیماران دہلی میں ہے، حاصل کر کے اس میں غالب لائبریری قائم کرے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا کہ اس تجویز کو عملی جامہ پہناتے وقت اس کا خیال رکھا جائے کہ یہ غالب کے شایان شان ہو۔ حمیدہ سلطان صاحبہ نے کہا کہ اس کے علاوہ دہلی میں ایک غالب ہال اور ایک غالب لائبریری بھی تعمیر ہونی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ میرے تخمینے کے مطابق اس اسکیم پر دس لاکھ روپے کی لاگت آئے گی۔ حمیدہ سلطان صاحبہ کی اس تجویز کے سلسلے میں کمیٹی نے بالاتفاق یہ رائے ظاہر کی کہ اگر دہلی اسٹیٹ غالب سینٹینری کمیٹی اس کام کے لیے معقول رقم جمع کر سکے تو وہ اس کو اپنے ذمے لے لے۔

سکریٹری نے ساہتیہ اکاڈمی سے موصول شدہ خطوط کی روشنی میں میٹنگ کو مطلع کیا۔

(۱) ساہتیہ اکاڈمی غالب پر اردو میں ایک کتاب شایع کرے گی جس میں غالب کے مختصر حالات زندگی اور ان کی منتخب تحریریں ہوں گی۔

(۲) اکاڈمی "ہندوستانی دانشور" کے زیر عنوان پروفیسر مجیب کی مرتب کردہ ایک کتاب انگریزی میں شایع کرے گی جس میں غالب کی مختصر سوانح اور منتخب تحریروں کا ترجمہ ہوگا۔

(۳) اکاڈمی نے یہ اطلاع بھی دی کہ یونیسکو غالب پر پروفیسر رالف رسل اور ڈاکٹر خورشید الاسلام صاحب سے ایک مونوگراف تیار کرا رہی ہے۔

مالک رام صاحب نے کمیٹی کو اطلاع دی کہ انھوں نے غالب میموریل جلد کی فہرست تیار کر لی ہے۔ یہ جلد ۵۰۰ صفحات کی ہوگی اور اس پر تقریباً دس ہزار روپیہ خرچ ہوگا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے کمیٹی سے بچوں کے لیے غالب پر دس، بیس صفحات کا کتابچہ شایع کرنے کی سفارش کی۔

ڈاکٹر گوپال ریڈی نے غالب کی مستند تصاویر، خطوط اور دوسری تحریروں کے عکس سے غالب البم تیار کرنے کی تجویز رکھی۔

صدر کے شکریے کے ساتھ میٹنگ ختم ہوئی۔

(احمد محی الدین سکریٹری)

—— ⁂ ——

(بقیہ صفحہ ۹ سے آگے)

ڈاکٹر میکنزی دالیس کو لکھا تھا جس کا ترجمہ نیچے دیا جا رہا ہے۔

"جب میں نے پہلے پہل اس کتاب کا ترجمہ پیش کرنے کا منصوبہ تیار کیا تو میرے دماغ میں کچھ شکوک پیدا ہوئے کہ اس ذمہ داری کو سنبھالنے کے لیے کون سے بہترین شخص کو بحیثیت مترجم ملازم رکھا جائے میں نے آخر اس کام کو اودھ اخبار سے وابستہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کے سپرد کرنے کا قطعی طور پر فیصلہ کر لیا اور اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان کے ترجمہ کو متعدد مبصرین نے منظور کر لیا ہے۔"

طوفان بے تمیزی:-

یہ ناولٹ بھی رتن ناتھ سرشار کے زور قلم کا نتیجہ ہے یہ ۱۸۹۴ء سے قبل خمکدہ سرشار کے زیر عنوان ایک رسالہ میں بالاقساط شائع ہوتا تھا اس رسالہ کے ایڈیٹر بھی سرشار ہی تھے۔ یہ رسالہ ڈاکٹر سی گھوش نظیرآباد لکھنؤ کے مطبع سے شائع ہوا کرتا تھا۔ بعد میں طوفان بے تمیزی کا انتخاب شائع کیا گیا۔ اس کے ٹائٹل پیج پر یہ درج ہے:-

"انتخاب لاجواب۔ طوفان بے تمیزی"

اس پر سن اشاعت درج نہیں ہے۔ یہ ناول [illegible] بک ڈپو فرنگ لاہور سے شائع ہوا۔ اس کے کل ۸۸ صفحات ہیں۔ یہ رائل سائز پر چھپا ہوا ہے۔ یہ ایک واقعاتی ناول ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک چھوٹی سی افواہ سے شہر میں کتنا خطرناک بلوہ ہو جاتا ہے اور فساد کرنے کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ ہر باب کے نمبرے کا عنوان دیا گیا ہے۔ اس میں ربط و ضبط حقیقتاً ہے تیسرے باب سے تک افسانے میں کوئی ربط نہیں۔ جبکہ کہانی کا مقصد ساتویں باب میں واضح کیا گیا ہے۔

فنی اعتبار سے یہ ایک ناکام کوشش ہے۔ سیدھا سادا اور سپاٹ سا قصہ ہے۔ توانائی کہیں محسوس نہیں ہوتی زبان کہیں کہیں افسانے کا ساتھ نہیں دیتی۔ کہیں زبان بھاگتی ہے تو کہیں کہانی رینگنے لگ جاتی ہے۔

لیکن طوفان بے تمیزی کے مطالعہ سے سرشار کے زوال پذیر دور کو سمجھنے میں مدد ضرور ملتی ہے۔

لنگے سیار:-

یہ ایک چھوٹا سا پمفلٹ ہے۔ اس کے صرف سولہ صفحے ہیں۔ یہ شمس المطابع لکھنؤ میں چھپا تھا۔ اس میں فسانۂ آزاد کی جلد اول کا ایک قصہ نظم بند کیا گیا ہے۔ تاکہ قارئین فسانۂ آزاد کی خوبیوں اور دلچسپیوں سے آگاہ اور لطف اندوز ہو سکیں۔

بقیہ صفحہ ۱۰ سے آگے

بجائے کوئی دوسرا لفظ رکھو شعر بہت عمدہ ہے؟ مگر یہ لفظ ثقیل ہے عام فہم نہیں۔ عزیز مرحوم نے جواب دیا۔ کہو تو "حبیر" کی جگہ پر "مرکز" رکھ دوں۔ [illegible] صاحب [illegible] نے کہا۔ ہاں کیا خوب؟ اور دوسروں نے بھی پسند کیا چنانچہ یہ لفظ بدل کر مرکز رکھ دیا گیا۔ مشاعرے میں جب عزیز مرحوم نے اپنی غزل پڑھی تو مشہور ڈرامہ نویس سید مہدی حسن احسن مرحوم نے مشاعرے میں کھڑے ہو کر عزیز سے بلند آواز سے کہا۔

"عزیز تمہارا یہ شعر اردو ادب میں ہمیشہ کے لیے رہ گیا" اور ان کی پیشن گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ (آغا شہر لکھنوی سیتاپور)

تبصرے

خلیل الرحمٰن اعظمی

آغازِ سحر

مجموعۂ کلام پروفیسر نادم بلخی
شائع کردہ: نیشنل بک سینٹر، ڈالٹن گنج (بہار)
قیمت: ۲۵ء۲۵ روپے

نادم بلخی ان نوجوان شاعروں میں ہیں جنھوں نے "سانیٹ" سے اپنے خصوصی شغف کا اظہار کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے مزاج کو اس صنف سے خاصی مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ "آغازِ سحر" میں "سانیٹ" کا حصہ سب سے پہلے ہمیں متوجہ کرتا ہے۔ ان میں شاعر کی اپنی شخصیت اور اس کے اپنے جذبات و تجربات کا بڑی بے ساختگی کے ساتھ اظہار ہوا ہے۔ نظمیں زیادہ تر خارجی موضوعات پر ہیں اور لب و لہجہ بھی مروجہ نظموں سے کچھ ہٹ کر نہیں ہے۔ اس لیے اس حصے کی شعریت خاصی دب گئی ہے۔ البتہ غزلوں میں جہاں روایتی انداز کے اشعار ہیں وہاں ایسے منتخب و منفرد شعر بھی مل جاتے ہیں جو ہمیں متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

مری گردن جھکی تھی مصلحت سے — وہ یہ سمجھے کہ سر خم ہو گیا ہے

یہی کہتی ہے ویرانی جہاں کی — زمیں کو چاہیے اب آسماں اور

میں کچھ دیا تھا فقط داستانِ غم اپنی — تمھاری بات نہ جانے کہاں سے آئی ہے

راہِ جنوں میں منزلِ آخر کہاں نصیب — رستہ کھلا ہوا ہے جہاں تک سفر کیا

نادم کا یہ پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ ان کے سانیٹ اور منتخب اشعار کے پیشِ نظر یہ توقع بے جا نہیں کہ وہ بہت جلد اپنے انفرادی لب و لہجہ کو تلاش کر لینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اجنبی

مجموعۂ کلام: شوار تخت ودھ
شائع کردہ: آنچل پبلیکیشنز، نئی دہلی
قیمت: پانچ روپے

کتاب کا نام "اجنبی" اور وہ دیباچہ جو "اجنبی" کے عنوان سے مصنف نے خود لکھا ہے ہمیں سب سے پہلے متاثر کرتا ہے۔ نظموں، غزلوں، قطعات اور متفرق اشعار کے مطالعے کے بعد شاعر کی ایک مخصوص شخصیت اور ایک ذہنی رویہ سامنے آتا ہے۔ یہ رویہ جسے احساسِ تنہائی کے علاوہ اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا موجودہ دور کی ایک عالمگیر کیفیت ہے۔ اس کیفیت کو شاعر نے اپنے انفرادی تجربے کی سطح پر ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ البتہ یہ کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں کہ نظموں اور قطعوں کی نسبت غزل میں درد کا اپنا کردار زیادہ موثر طور پر سامنے آیا ہے۔ نظموں اور قطعوں پر ساحر اور بعض دوسرے شعراء کے لہجے کی پرچھائیاں صاف نظر آتی ہیں البتہ غزلوں میں کہیں کہیں شاعر کے اپنے لہجے کا بانکپن اس طور پر نمایاں ہوا ہے کہ ہم رک کر سوچنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔

مری خوشی نے لیے تو اسیرِ غم رہ کر — نہ کر خدا کے لیے اور شرمسار مجھے

بہ قدرِ ظرف ترا غم بھی میرے پاس نہیں — اسی لیے تو مسرت بھی مجھ کو راس نہیں

بھلا دیا ہے ترے عشق میں زمانے کو — ترس رہا ہے جہاں میری دوستی کے لیے

انھیں پہچاننے کی فکر میں ہوں — کہ جن سے مدتوں کی دوستی ہے

ہے قدموں کے نیچے کب سے زمیں تھی — میں ساحل کی طلب میں بہہ گیا ہوں

ہمارا خیال ہے کہ درد اپنے کلام کے اس عنصر کو اور ابھارنے کی کوشش کریں تو اردو غزل کو ایک نئے ذائقے سے آشنا کر سکتے ہیں۔

راہ کا کانٹا

مصنف: شانتی رنجن بھٹاچاریہ
ناشر: بھٹاچاریہ پبلیشٹی، شری گوپال ملک لین، کلکتہ ۱۲
قیمت: دو روپے

شانتی رنجن بھٹاچاریہ ایک بنگالی ادیب ہیں جو اردو میں لکھتے ہیں۔ بنگال کے ادیبوں نے بنگالی زبان میں ناول اور افسانے کی صنف کو جس معیار پر پہنچا دیا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اردو افسانہ نگاری پر بنگالی افسانوں کے ترجموں کا جو اثر ہے اس سے بھی ہم سب واقف ہیں۔ بھٹاچاریہ غالباً پہلے بنگالی ہیں جنھوں نے براہِ راست اردو افسانے کو بنگال کے طرزِ فکر اور وہاں کی زندگی سے متعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔ اس مجموعے کے افسانے زیادہ تر اس زمانے میں لکھے گئے جب ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر افسانے میں مقصدیت کا پہلو نمایاں تھا اور عوامی زندگی کی عکاسی ہی افسانہ نگار کا مطمحِ نظر ہوتا تھا۔ ان افسانوں میں بھی یہ عنصر نمایاں ہے۔ لیکن یہ سب افسانے زندگی کے مشاہدات و تجربات کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں اس لیے ان میں کہانی پن کا عنصر کم نہیں ہونے پایا ہے۔ بعض افسانوں میں نفسیاتی تجزیے کی بڑی خوبصورت جھلکیاں ملتی ہیں جیسے عورت اور مال میں۔ افسوس ہے کہ اس مجموعے کی کتابت و طباعت پر پوری توجہ صرف نہیں کی گئی۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند کی طرف سے پرنٹر و پبلشر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا